تحریر: علامہ محمد اسد (حال متوطن مراکش)
ترجمہ: محمد معین خان بی۔ اے (عثمانیہ)

اسلام کا مقصد و منہاج

علامہ محمد اسد صاحب کی کتاب کی تازہ قسط پیش خدمت ہے۔ یہ کتاب کے پہلے باب "THE OPEN ROAD OF ISLAM" کا ترجمہ ہے۔ مضمون کی مناسبت سے میں نے اس کا عنوان "اسلام کا مقصد و منہاج" رکھا ہے۔ غالباً آپ بھی اسے پسند فرمائیں گے۔ مضمون ذرا خشک اور فلسفیانہ ہے۔ اور اس میں ادق قسم کی اصطلاحیں[1] استعمال کی گئی ہیں۔ قارئین الحق کو ذہنی الجھن سے بچانے کی خاطر میں نے بعض بعض جگہ اصل انگریزی الفاظ قوسین میں درج کر دیئے ہیں۔ (محمد معین خان)

موجودہ دور کے سب سے مخصوص نعروں میں ایک "تسخیر کائنات" کا نعرہ بھی ہے۔ ذرائع حمل و نقل نے آج جو حیرت انگیز ترقی کر لی ہے وہ گذشتہ نسلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئی ہوگی۔ حمل و نقل کے ان ذریعوں نے اسباب و اشیاء کو اس قدر وسیع پیمانہ پر اور اتنی سرعت کے ساتھ ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل کرنا شروع کر دیا ہے کہ نوعِ انسانی کی پوری تاریخ میں اسکی نظیر نہیں ملتی۔ اس ترقی کا نتیجہ یہ نکلا کہ دنیا کی تمام قومیں معاشی اعتبار سے ایک دوسرے کی دستِ نگر ہو گئی ہیں، صورتِ حال تو یہ ہے کہ آج کوئی قوم دوسری قوموں سے الگ تھلگ اور بے تعلق نہیں رہ سکتی، وہ دن گئے جبکہ معاشی ترقی صرف مقامی ہوا کرتی تھی۔ اب تو اس نے عالمی نوعیت اختیار کر لی ہے۔ کم از کم اس کے رجحان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ نہ تو سیاسی حدود ہی کو ملحوظ رکھتی ہے۔ اور نہ جغرافیائی بُعد و مسافت کو۔ معاشی ترقی کے ساتھ ساتھ نہ صرف اشیائے تجارت ہی کو منتقل کرنے کی ضرورت روز بروز بڑھتی جاتی ہے، بلکہ افکار (ثقافتی اقدار) کو منتقل کرنے کی ضرورت میں بھی یوماً فیوماً اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ مسئلہ کا یہ پہلو ا-

---

[1] راقم مرتب کو بھی اس کے بعض مقامات سے الجھاؤ ہوا مگر مجموعی لحاظ سے مفید سمجھ کر شائع کیا جا رہا ہے۔ (سمیع الحق)

خالص مادی پہلو کے مقابلہ میں بہت زیادہ اہم ہے۔ یہ دونوں ـــــ معاشی اور ثقافتی ـــــ قوتیں جہاں رہ گذر کل پر لمبا اوقات دوش بدوش گامزن نظر آتی ہیں، وہاں ان کے قواعد حرکہ میں ایک نمایاں فرق بھی دکھائی دیتا ہے۔ معاشیات کے مبادی قوانین کا اقتضاء یہ ہے کہ قوموں کے مابین تبادلۂ اشیاء کا عمل باہمی بنیاد پر ہو۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم سدا خریدار بنی رہے اور دوسری صرف تاجر۔ بلکہ دونوں قوموں کو بالآخر داد و ستد کے دونوں رول ایک ساتھ انجام دینے پڑتے ہیں۔ اس سے کوئی بحث نہیں کہ یہ رول براہ راست ادا کئے جاتے ہیں یا دیگر معاشی عوامل کی وساطت سے انجام دئے جاتے ہیں۔ لیکن ثقافت کے میدان میں تبادلۂ اشیاء کے اس آہنی قانون کی بجا آوری ناگزیر نہیں۔ یا کم از کم یہاں اس قانون کی پا بجائی ہمیشہ آشکارا نہیں ہوا کرتی۔ اس چیز کو دوسرے لفظوں میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ خیالات اور ثقافتی موثرات کی منتقلی کا عمل ہمیشہ باہمی داد و ستد کے اصول پر مبنی ہونا ضروری نہیں۔ فطرت انسانی میں یہ بات بھی پائی جاتی ہے کہ ایسی قومیں اور تہذیبیں جو معاشی اور سیاسی اعتبار سے زیادہ طاقتور ہوتی ہیں وہ اپنے سے کمزور اور سست گام قوموں کو اپنی جانب بڑی شدت کیساتھ مائل کر لیتی ہیں اور ان کے ذہن و معاشرہ پر اپنے اثرات مرتسم کرنے لگتی ہیں، درآنحالیکہ خود ان کا ذرا سا بھی اثر قبول نہیں کرتیں۔ جہاں تک آج کی مغربی اور اسلامی دنیاؤں کے باہمی روابط و تعلقات کا معاملہ ہے اسکی صورت حال بھی کچھ ایسی ہی ہے۔

آج اسلامی دنیا پر مغربی ثقافت جو یک طرفہ قسم کا زبردست اثر ڈال رہی ہے، وہ ایک تاریخی مبصر کے نقطۂ نظر سے قطعاً کوئی اچنبھا نہیں ہے، کیونکہ یہ تو ایک طویل تاریخی عمل (HISTORIC PROCESS) کا نتیجہ ہے جسکی بہت سی مثالیں ملیں گی۔ اس توجیہہ سے تو مورخوں کی تسلی ہو جاتی ہے لیکن ہم جیسے لوگوں کے لئے مسئلہ لاینحل ہی رہ جاتا ہے۔ ہم لوگوں کے لئے جو اس ڈرامہ کے محض شوقین تماشائی نہیں بلکہ اس کے حقیقی اور عملی کردار ہیں، ہم لوگوں کے لئے جو اپنے نبیؐ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین گردانتے ہیں۔ مسئلہ کی ابتداء سچ پوچھو تو یہیں سے ہوتی ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام دیگر مذاہب کے برخلاف نہ صرف ذہن کا ایک روحانی رویّہ (Spiritual Attitude) ہے جو مختلف نظاموں کے ساتھ توافق پذیر ہے بلکہ ثقافت کی ایک خود مکتفی اقلیم بھی ہے اور معاشرت کا ایک واضح اور معرف نظام بھی۔ جب ایک اجنبی ثقافت، جیسا کہ آج کی صورت حال ہے، اپنی شعاعیں ہم پر بکھیر رہی ہو اور ہمارے ثقافتی نظام میں کچھ تبدیلیاں پیدا کرنے کی بھی موجب بن رہی ہو تو اس وقت ہم پر یہ معلوم کرنا فرض ہو جاتا ہے، کہ آیا اس اجنبی تاثر کا دھارا خود ہمارے ثقافتی ممکنات

(cultural possibilities) کی موافق سمت بہہ رہا ہے یا مخالف سمت میں آیا یہ تاثر اسلامی ثقافت کے جسد میں تریاق کا عمل کر رہا ہے یا کوئی سمومیت پھیلا رہا ہے۔؟

اس سوال کا جواب صرف تحلیل و تجزیہ ہی کے ذریعہ معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس غرض کے لئے ہمیں چاہیئے کہ اسلامی اور مغرب جدید دونوں ثقافتوں کی محرک قوتوں کا پتہ لگائیں۔ پھر اس امر کی تحقیق کریں کہ ان دونوں کے مابین تعاون عمل کس حد تک ممکن ہے۔ چونکہ اسلامی ثقافت اپنی اصل کے اعتبار سے ایک مذہبی ثقافت ہے، اس لئے ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے حیات انسانی کی اقلیم میں مذہب کے عام حدود عمل متعین کرنے کی کوشش کریں۔

جس چیز کو ہم "مذہبی رویہ" (Religious attitude) سے تعبیر کرتے ہیں، وہ انسان کا اور حیاتیاتی ساخت کا قدرتی ماحصل ہے۔ زندگی کے رمز، ولادت و موت کے رمز اور ازل و ابد کے رمز کی خود ہی تشریح و توجیہہ کرنا تو انسان کی قدرت سے باہر ہے، کیونکہ اس کے سمندِ عقل کی تگ ناقابلِ عبور دیواروں کے پاس ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا اس کے لئے صرف دو ہی امکانات رہ جاتے ایک تو یہ کہ وہ زندگی کو ایک کلیت (Totality) کی حیثیت سے سمجھنے کی کوشش ترک کر اس صورت میں وہ صرف خارجی تجربات کی شہادت ہی پر تکیہ کرے گا اور اپنے نتائج علمیہ کو تجربات کی وسعتوں تک محدود کرے گا۔ اسطرح وہ زندگی کے منفرد جزئیات کے درک کے قابل ہو جائے گا جن کی تعداد و وضاحت اسی تیز و سست رفتار سے بڑھتی اور پھیلتی جاتی ہے جس رفتار سے خود انسان کے علم فطرت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے، تاہم جزئیات ہمیشہ جزئیات ہی رہیں گے۔ رہ گیا ادراک کلیت کا معاملہ عقلِ انسانی اپنے منہاجیاتی وسائل (Methodical Equipment) کے باوجود اسکی گرد تک نہ پا سکے گی۔ علوم فطرت کا قافلہ اسی نہج سے رواں ہے، دوسرا امکان جو سا امکان کے ساتھ ساتھ وجود پذیر رہتا ہے وہ ہے مذہبی طریق۔ مذہب انسان کو ایک باطنی بیشتر وہ تجربہ کی وساطت سے زندگی کی وحدانی تعبیر و تشریح (Unitary explanation) قبول کرنے مائل کر لیتا ہے۔ اس کا یہ عمل بالعموم اس تصویر پر مبنی ہوتا ہے کہ ایک خالق مطلق کی ہستی موجود ہے کائنات پر ایسے سوچے سمجھے منصوبہ کے مطابق حکمران ہے جس کا احاطہ کرنا فہم انسانی کی استعداد بعید ہے۔ تاہم یہ ضروری نہیں کہ یہ تصور انسان کو زندگی کے ان حقائق و جزئیات کی تحقیق و تفحص سے بھی باز رکھے جو خارجی مشاہدہ کے لئے خود بخود سامنے آجایا کرتے ہیں۔ کیونکہ خارجی (سائنسی) داخلی (مذہبی) ادراک کے مابین کوئی خلقی بیر نہیں ہے۔ مذہبی طریق ہی فی الحقیقت وہ واحد طریق امر

(Speculative possibility) ہے جسکی بدولت پوری زندگی کو جوہر اور قوت محرکہ کا اتحاد یا مختصر الفاظ میں ایک عمدہ متوازن و ہم آہنگ کلیت (Totality) سمجھا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہم آہنگ کی اصطلاح کا استعمال یہاں بہت ہی بے محل ہے، لیکن اس سلسلہ میں یہ اصطلاح بڑی اہمیت کی حامل ہے، کیونکہ یہ خود انسان کے باطن میں ایک متقابل رویّہ (Corresponding Attitude) کی موجودگی پر دلالت کرتی ہے۔ مذہبی آدمی یہ جانتا ہے کہ انسان کو اس کے خارج میں جو کچھ پیش آتا ہے اور اس کے باطن میں جو کچھ گذرتا ہے، وہ قوتوں کی اندھا دھند کارفرمائی کا نتیجہ ہرگز نہیں ہو سکتا جس میں شعور و ارادہ کا کوئی دخل ہی نہ ہو، وہ تو یہ یقین رکھتا ہے کہ یہ سب کچھ محض خدائے علیم و خبیر کی مشیت کا اقتضاء ہے۔ لہٰذا یہ خلقی طور پر قدرت کے نظام تقدیر سے مربوط ہے۔ اسطرح انسان اس شدید اختلاف کو نمٹانے کے قابل ہو جاتا ہے، جو نفس انسانی اور حقائق و ظواہر کی اس دنیا کے معروض کے مابین پایا جاتا ہے جسے عرف عام میں فطرت کہتے ہیں۔ انسان اپنی روح کی تمام تر پیچیدہ میکانیت، اپنی تمام تر خواہشات و خدشات اور اپنے تمام تر احساسات و مجہول شبہات کیساتھ اپنے تئیں ایک ایسی فطرت کے مقابل پایا جاتا ہے جس میں فیض وجود اور خوف و سکون ایک حیرت انگیز اور ناقابل بیان انداز میں باہم مخلوط ہیں اور بظاہر ایسے خطوط پر عمل پیرا ہیں، جو ذہن انسانی کی ساخت و اسالیب سے قطعاً مختلف ہیں۔ اس تخالف کو نمٹانے میں خالص عقلی فلسفہ (Intellectual Philosophy) یا تجرباتی سائنس (Experimental Science) آج تک کامیاب نہ ہو سکی، ٹھیک یہی وہ مرحلہ ہے، جہاں مذہب اپنا قدم دھرتا ہے۔

مذہبی ادراک اور تجربہ کی روشنی میں انسان کے نفس خود آگاہ اور گنگ و بے پرواہ فطرت کے مابین ایک روحانی ہم آہنگی کا رشتہ قائم کر دیا جاتا ہے، کیونکہ انسان کا انفرادی شعور اور فطرت، جو انسان کے خارج کو بھی محیط ہے اور باطن کو بھی، دونوں ایک ہی مشیت خلاّق (Creative will) کے گو مختلف مگر ہم ربط مظاہر (Coordinate manifestations) کے سوا کچھ نہیں، اسطرح مذہب انسان کو جس بے پایاں افاضہ سے بہرہ مند کرتا ہے وہ یہ تصوّر ہے کہ اسکی ذات تخلیق کے سلسلۂ ابدی کی ایک عمدہ کڑی اور تقدیر کائنات کے لامتناہی نظام کا ایک متمیز و قطعی جزو ہے۔ اس تصور کا نفسیاتی ماحصل روحانی تحفظ کا عمیق احساس ہے ـــــ بیم و رجا کا وہ باہمی توازن جو ایک مذہبی کو، خواہ اسکا مذہب کچھ ہی کیوں نہ ہو، ایک لامذہبی سے متمیز کرتا ہے۔

یہ بنیادی موقف دنیا کے تمام عظیم مذاہب میں مشترک ہے خواہ ان کے مخصوص عقائد کچھ

ہی کیوں نہ ہوں۔ ایک اور چیز جو ان مذاہب میں اتنی ہی مشترک ہے، وہ انسان سے ان کی یہ اخلاقی اپیل ہے کہ وہ خدا کی مشیّت بیّنہ (Manifest will) کے آگے اپنا سر اطاعت خم کر دے لیکن اسلام اور صرف اسلام ہی ایسا مذہب ہے جو اس نظریاتی توضیح و موعظت کی سرحدوں سے پار گذر جاتا ہے۔ یہ مذہب نہ صرف یہ تعلیم دیتا ہے کہ ساری زندگی فی الاصل ایک وحدت (Unity) ہے ـــــ اس لئے کہ یہ توحید باری سے رواں ہوتی ہے۔ بلکہ اپنے ہر پیرو کو اپنی انفرادی دنیاوی زندگی کے حدود میں اور وجود و شعور کے دائروں کے اندر اتحاد خیال و عمل کا مظاہرہ کرنے کا عملی طریقہ بھی سکھاتا ہے۔ زندگی کے اس بلند ترین مقصد کے حصول کے لئے اسلام کسی شخص کو ترکِ دنیا پر مجبور نہیں کرتا۔ اس مذہب میں نہ تو تزکیۂ روح کے لئے کسی قسم کے شدائد و مصائب جھیلنے کی ضرورت پڑتی ہے، اور نہ حصولِ نجات کے لئے ذہنوں پر ناقابلِ فہم عقائد مسلّط کئے جاتے ہیں۔ اس قبیل کی تمام چیزوں سے اسلام کا قطعاً کوئی علاقہ نہیں۔ کیونکہ یہ مذہب نہ تو کوئی صوفیانہ عقیدہ ہے اور نہ کوئی فلسفہ۔ یہ تو ایک نظامِ حیات ہے، قوانینِ فطرت کے عین مطابق جسے خالق نے اپنی مخلوق کے لئے پسند اور مامور فرمایا ہے۔ اس نظام کی اعلیٰ ترین کامیابی حیاتِ انسانی کے مادی اور روحانی پہلوؤں کی مطابقت و ارتباط ہے۔ اسلامی تعلیمات میں انسان کے مادی اور اخلاقی وجود کے بنیادی اختلاف کو یکسر مٹانے کی غرض سے زندگی کے ان دونوں پہلوؤں کو نہ صرف "متوافق" ہی نہیں بنایا جاتا ہے بلکہ یہ حقیقت بھی ذہن نشین کرائی جاتی ہے کہ ان دونوں پہلوؤں کی ہم موجودیت (Co existence) اور عدم انفکاکیت ہی زندگی کی قدرتی اساس ہے۔

ہماری دانست میں اسلام کے مخصوص طریقۂ صلوٰۃ کی توجیہہ جس میں روحانی ارتکاز اور چند جسمانی حرکات باہمدیگر مربوط کئے جاتے ہیں، یہی ہو سکتی ہے۔ اسلام کے بعض کینہ پرور نقاد اکثر اسی طریقۂ عبادت کو اپنے اس الزام کے ثبوت میں پیش کیا کرتے ہیں کہ اسلام ایک رواجیت پسند اور ظاہر داری کا مذہب ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ غیر مذاہب کے لوگ جو "جسمانی" سے "روحانی" کو اس انداز سے جدا کرنے کے خوگر ہیں جس انداز سے ایک گوالا دودھ سے مکھن جدا کرتا ہے، ان کی سمجھ میں یہ بات ہرگز آسانی سے نہیں آسکتی کہ اسلام کے شیرِ خالص میں یہ دونوں عناصر اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے مختلف ہونے کے باوجود کمال ہم آہنگی سے وجود پذیر ہیں اور اپنے تئیں ایک ساتھ ظاہر کرتے ہیں، دوسرے لفظوں میں اسلامی صلوٰۃ ذہنی ارتکاز اور جسمانی حرکات پر مشتمل ہے۔ اسکی وجہ ایک تو یہ ہے کہ خود حیاتِ انسانی کی ساخت ایسی ہی کچھ ہے اور دوسری یہ کہ ہم پر یہ واجب ہوتا

ہے کہ ہم اپنے رب کی بارگاہ میں اسطرح حاضر ہوں کہ ہماری عبائے عبودیت پر ان تمام اوصاف و ملکات کے رنگ نمایاں ہوں جو اس نے ہمیں ودیعت کئے ہیں۔

فکر و عمل کے اس انداز کی مزید مثال آپ کو رسم طواف کعبہ میں ملے گی۔ چونکہ مکہ معظمہ میں داخل ہونے والے ہر شخص پر یہ واجب ہو جاتا ہے کہ وہ کعبۂ بیت اللہ کا سات بار طواف کرے اور چونکہ اس فریضہ کی بجا آوری حج بیت اللہ کے مناسک میں سے ایک ہے، اس لئے ہمیں اپنے آپ سے یہ پوچھنے کا حق حاصل ہے کہ آخر اس کا کیا مطلب ہے۔؟ کیا عبادت کا ایسے رسمی طریقہ کی صورت میں اظہار کیا جانا ضروری ہے۔؟

جواب بالکل واضح ہے۔ اگر ہم کسی شئے کے گرد ایک دائرہ کی شکل میں گھومیں تو ہم اس شئے کو اپنے عمل کا گویا مرکز قرار دے لیتے ہیں۔ کعبہ بیت اللہ جس کی طرف ہر مسلمان نماز میں اپنا رخ کرتا ہے، توحید باری کی علامت کو ظاہر کرتا ہے۔ طواف میں حاجیوں کی جسمانی نقل و حرکت حیاتِ انسانی کی فعلیت کی علامت کو ظاہر کرتی ہے۔ لہذا طواف کا مفہوم یہ ہے کہ خدا کے تصوّر اور اسکی توحید کو نہ صرف ہمارے ذہنی افکار ہی کا مرکز ہونا چاہئے بلکہ ہماری ساری زندگی اور ہمارے تمام اعمال و مساعی کا مرکز بھی ـــــ قرآنِ پاک کے اس ارشاد کے مطابق کہ :

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ　　اور میں نے جنوں اور انسانوں کو اس لئے پیدا کیا

إِلَّا لِيَعْبُدُونَ۔ (سورہ ۵۱ : ۵۶)　　ہے کہ میری عبادت کریں۔

پس اسلام کا تصوّرِ عبادت دیگر تمام مذاہب کے تصورِ عبادت سے قطعاً مختلف ہے اسلام میں یہ تصورِ خالص عباداتی اعمال مثلاً نماز یا روزہ ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ انسان کی ساری عملی زندگی کو محیط ہے۔ اگر ہماری کل زندگی کا مدعا خدا کی عبادت ہے تو ہم پر لازم ہے کہ اس زندگی کے تمام پہلوؤں کی مجموعیت (Totality) کو ایک کثیر پہلو اخلاقی ذمہ داری (Complex Responsibility) سمجھیں۔ بریں بناء ہمارے تمام اعمال حتیٰ کہ وہ بھی جو بظاہر نہایت معمولی سے نظر آتے ہیں، عبادات ہی کی طرح انجام دئے جانے چاہئیں۔ یعنی اس شعور کے ساتھ انجام دئے جانے چاہئیں کہ یہ سب اللہ تعالیٰ کے نظامِ کائنات کے جزو ہیں۔ ہر چند کہ یہ بات ایک عامی کے لئے تصورِ بعید کی حیثیت رکھتی ہے، لیکن کیا تصورات کو واقعیت کا قالب عطا کرنا مذہب کا مدعا نہیں ہے۔؟

اس بارہ میں اسلام کا جو موقف ہے اس میں کسی مغالطہ کی گنجائش نہیں پائی جاتی۔ اسلام کی سب سے پہلی تعلیم یہ ہے کہ حیاتِ انسانی کے تمام گوناگوں اعمال میں خدا کی عبادت مستترہ ہی اس زندگی کا

اصل مدعا ہے، دوسری یہ کہ جب تک ہم زندگی کو روحانی اور مادی دو خانوں میں تقسیم کرتے رہیں گے اس وقت تک اس مدعا کا حاصل ہونا ممکن نہیں۔ لہٰذا لازم ہے کہ ہمارے شعور و عمل میں زندگی کے یہ دونوں پہلو ایک ہم آہنگ ذات (Harmonius entity) میں متحد و مربوط کر دیئے جائیں اور یہ بھی لازم ہے کہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو باہم متحد و مربوط کرنے کی جو جد و جہد ہم کرتے ہیں، اس میں ہمارا تصوّر توحیدِ باری ہمیشہ منعکس ہوتا رہے۔

یہ اندازِ فکر منطقی اعتبار سے اسلام اور دیگر مذاہب کے مابین ایک فرقِ مزید پیدا منتج ہوتا ہے۔ یہ فرق آپ اس حقیقت پائیں گے کہ اسلام تعلیم عقائد کی حیثیت سے نہ صرف انسان اور اس کے خالق کے باہمی مابعد الطبعی تعلقات (Metaphysical Relations) ہی کے تعیّن کی ذمہ داری لیتا ہے بلکہ بلاکم و کاست فرد اور اس کے سماجی ماحول کے مابین دنیاوی تعلقات کے تعیّن کی بھی۔ اسلام میں حیاتِ دنیاوی محض ایک خالی خولی خول یا عالمِ آخرت کا بے معنی پرتو نہیں بلکہ ایک مکمل ایجابی وجود سمجھی جاتی ہے۔ خود باری تعالیٰ ایک وحدت ہے نہ صرف فی الذات بلکہ فی المقصد بھی۔ لہٰذا اسکی مخلوق بھی ایک وحدت ہے۔ فی الذات امکاناً اور فی المقصد یقیناً۔

اسلام کی رو سے مدعائے حیات عبارت ہے۔ عبادتِ الٰہی سے ان وسیع معنوں میں جنکی سطورِ بالا میں صراحت کی گئی ہے۔ اور صرف یہی وہ تصوّر ہے جو ہمیں یہ بتلاتا ہے کہ انسان اپنی انفرادی حیاتِ دنیاوی کے دائرہ کے اندر کاملیت (Perfection) سے شاد کام ہو سکتا ہے۔ دنیا کے تمام مذاہب میں صرف اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو یہ اعلان کرتا ہے کہ ہماری اس دنیائے آب و گل میں فرد کا کاملیت (Perfection) سے بہرہ ور ہونا ممکن ہے، اس مقصد کی بجا آوری کو اسلام نام نہاد "جسمانی" خواہشات کے مغلوب ہونے تک ملتوی نہیں رکھتا جیسا کہ مسیحیت کا طریقہ ہے، نہ اسلام انسان کے بلند سے بلند تر مراتب پر علی الاتصال جنم لینے کا یقین دلاتا ہے جیسا کہ ہندومت کا معاملہ ہے۔ اور نہ اسلام بدھ مت سے اس امر پر اتفاق کرتا ہے کہ کاملیت و نجات — (Perfection and Salvation) کا حصول صرف اسی وقت ممکن ہو سکتا ہے جبکہ فرد اپنی ہستی کو فنا اور دنیا کے ساتھ اپنے جذباتی علائق کو معدوم کر دے۔ نہیں! — اسلام تو پورے وثوق کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ انسان اپنی دنیاوی انفرادی زندگی ہی میں اور زندگی کے تمام دنیاوی ممکنات سے بھرپور طریقہ سے متمتع ہوتے ہوئے کاملیت (Perfection) سے ہم کنار ہو سکتا ہے۔

— (باقی آئندہ) —